سورۃ البقرۃ (۲۵)

آیت : ۳۵

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲۵:۲ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵

© rasailojaraid.c

© rasailojaraid.c

۲ : ۲۵ : ۱ اللغۃ

[وَقُلْنَا] "وَ" (بمعنی اور) اور "قُلْنَا" کے مادہ، وزن اور معنی پر ابھی اوپر والی آیت یعنی ۲ : ۲۴ : ۱ (۱) میں بات ہو چکی ہے جس کی روشنی میں یہاں "قُلْنَا" کا ترجمہ "ہم نے کہا" ہی ہوگا۔ جیسے بعض حضرات نے سیاقِ عبارت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "ہم نے فرمایا"، "ہم نے حکم دیا" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ "کہنا" کی بجائے "فرمانا" کا استعمال تو متکلم کے رتبہ کے لحاظ سے پھر بھی درست محاورہ ہے مگر "حکم دیا" والا ترجمہ نہ صرف لفظاً اصل سے بہت دور ہے (کہ بظاہر تو یہ "اَمَرْنَا" کا ترجمہ ہے) بلکہ سیاقِ عبارت کے لحاظ سے بھی چنداں موزوں نہیں ہے۔ البتہ اس سے پہلی (گزشتہ) آیت (۲:۳۴) میں "قُلْنَا" کا ترجمہ "ہم نے حکم دیا" مناسب تھا۔

[یٰاٰدَمُ] میں ابتدائی "یا" (جو رسم عثمانی میں بحذف الف لکھی جاتی ہے) تو حرفِ نداء بمعنی "اے" ہے۔ اور "آدم" کے مادہ، وزن وغیرہ پر البقرہ : ۳۱ یعنی ۲ : ۲۲ : ۱ (۲) میں بات ہو چکی ہے

۲ : ۲۵ : ۱ (۱) [اُسْکُنْ] کا مادہ "س ک ن" اور وزن "اُفْعُلْ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "سَکَنَ یَسْکُنُ" (باب نصر سے) آتا ہے اور مصدر یا صلہ کے فرق کے ساتھ اس کے معنی بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) "سَکَنَ یَسْکُنُ سُکُوْنًا" کے معنی ہیں "ٹھہر جانا، رک جانا، (حرکت سے) بند ہونا" مثلاً "بارش کا برستے برستے رک جانا" کے لیے کہیں گے "سکن المطرُ" (بارش رک گئی)۔ اس صورت میں یہ فعل لازم ہی ہوتا ہے۔

(۲) اور یہی فعل (اسی باب اور مصدر کے ساتھ) جب "اِلٰی" کے صلہ کے ساتھ آئے تو اس کے معنی "...... سے سکون حاصل کرنا، ...... سے راحت اور آرام پانا" ہوتے ہیں مثلاً کہیں گے "سکن الیہ" (اس نے اس سے سکون پایا) ــــ اور کبھی ان معنوں (سکون پانا) کے لیے یہی فعل "فی"

© rasailojaraid
© rasailojaraid

کے صلہ سے استعمال ہوتا ہے جیسے رات کے بارے میں قرآن کریم میں کئی بار آیا ہے "لِتَسْكُنُوا فِيهِ" (تاکہ تم اس یعنی رات میں آرام پاؤ)

(۳) اور سَكَنَ يَسْكُنُ سَكَنًا و سُكْنًى" مفعول بنفسہ کے ساتھ اور "فی" یا "بِ" کے صلہ کے ساتھ بھی بطور فعل متعدی آتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں : "(کسی جگہ) رہنے لگ جانا یعنی رہائش اختیار کرنا، وطن بنالینا، ..... میں بسنا، ..... میں رہنا" مثلاً کہیں گے : سَكَنَ الدَّارَ و بالدارِ و فی الدارِ (وہ گھر میں رہنے لگ گیا) ۔ زیرِ مطالعہ آیت میں فعل امر "اُسْكُنْ" ان ہی معنی کے لیے آیا ہے ۔

(۴) سَكُنَ يَسْكُنُ سَكُونَةً (باب کرم سے) آئے تو اس کے معنی "مسکین ہو جانا ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس باب (کرُم) سے اس فعل کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا ــــــــ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے باب نصر والے مختلف صیغے چودہ جگہ وارد ہوئے ہیں ۔ صلہ کے ساتھ بھی اور بغیر صلہ کے بھی ۔ اور زیادہ تر مندرجہ بالا دوسرے اور تیسرے معنی (آرام پانا اور سکونت اختیار کرنا) کے لیے استعمال ہوئے ہیں

● زیرِ مطالعہ کلمہ "اُسْكُنْ" (جس کا "س" اپنے ماقبل ھمزۃ الوصل کی بناء پر "آدم" کی "میم" کے ساتھ ملا کر پڑھا جاتا ہے) اس فعل ثلاثی مجرد (باب نصر) سے فعل امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے ۔ اور یہ یہاں بغیر صلہ کے مندرجہ بالا تیسرے معنی (..... میں رہنے لگنا) کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ یعنی "تو رہ"، "تو بس"۔ سکونت اختیار کر ۔

۲ : ۲۵ : ۱ (۲) [اَنْتَ وَزَوْجُكَ] میں "اَنْتَ" تو ضمیر برائے واحد مخاطب مذکر ہے جس کا اردو ترجمہ "تو" ہے اور "وَ" عاطفہ بمعنی "اور" ہے ۔ "زَوْجُكَ" میں آخری "كَ" تو ضمیر مجرور بمعنی "تیری" یا "تیرا" ہے ۔ اور لفظ "زوج" کا مادہ "ز و ج" اور وزن "فَعْلٌ"

© rasailojaraid
© rasailojaraid.

ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کے علاوہ لفظ "زوج" کے بارے میں پوری وضاحت البقرہ : ۲۵ یعنی ۲ : ۱۸ : ۱(۸) میں گزر چکی ہے۔

● آیتِ زیرِ مطالعہ میں "زوج" کے معنی "بیوی" ہیں۔ کیونکہ مرد مخاطب (آدم) کے زوج (جوڑے) کی بات ہو رہی ہے۔ اس لیے اردو میں اس کا ترجمہ "بیوی"، "بی بی" اور "جورو" کیا گیا ہے۔ بعض نے صرف "عورت" ترجمہ کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست ہے۔ اگرچہ وہ "زوج" سے زیادہ "امرأۃ" کا ترجمہ لگتا ہے۔

۲ : ۲۵ : ۱(۳) [الْجَنَّةَ] کا مادہ "ج ن ن" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعْلَةٌ" ہے (الجنّة کی آخری تاء کی فتحہ (ــَـ) کی وجہ آگے "الاعراب" میں بیان ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کے استعمال اور خود لفظ "جَنّة" اور اس کی جمع "جناتٌ" پر البقرہ : ۲۵ یعنی ۲ : ۱۸ : ۱(۴) پر مفصل بات ہو چکی ہے۔ "جنة" کے معنی "باغ" ہیں۔ یہاں (قصۂ آدم میں) "الجنة" سے مراد کونسی جنت یا کون سا "باغ" ہے۔ اس کے لئے کسی اچھی اور مستند تفسیر کو دیکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ بعض "روشن خیالوں" نے "جنة" کو ایک جگہ (Place) کی بجائے ایک حالت (State) مراد لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان حضرات کے اس "جدید مفہوم" کی توجیہ کسی فلسفیانہ موشگافی کے ذریعے سے ہو تو ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے پہنچنے والی تفسیر سے تو اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اور صحابہؓ قرآن کے الفاظ و معانی (یعنی ظاہر و باطن) کے فہم پر یقیناً بعد میں آنے والوں کی نسبت زیادہ قادر تھے۔

۲ : ۲۵ : ۱(۴) [وَكُلَا مِنْهَا] یہ دراصل "وَ" (اور) + "كُلَا" (جس کی وضاحت ابھی ہوگی) + "مِنْ" (میں سے) + "ها" (ضمیر مؤنث بمعنیٰ "اس") کا مرکب ہے۔

© rasailojaraid.com

اس میں لفظ "کُلَا" کا مادہ "ا ک ل" اور وزنِ اصلی "اُفْعُلَا" ہے۔ یعنی اس کی اصلی شکل "اُأْكُلَا" بنتی تھی اور اسے عربوں کے نطق میں قاعدۂ مہموز [ھمزۂ متحرکہ کے بعد ھمزہ ساکنہ ماقبل کی حرکت کے موافق حرف (ا، و یا ی) میں بدل جاتا ہے۔] کے مطابق "اُوْكُلَا" ہونا چاہیے تھا مگر علمائے صرف نے دیکھا کہ عرب لوگ تین افعال "اَخَذَ، اَمَرَ اور اَكَلَ" کے فعل "امر" میں خلافِ قیاس (یعنی اس طرح کے دیگر مھموز الفاء افعال کے طریقِ استعمال کے برعکس) ابتدائی ھمزہ گرا کر بولتے ہیں۔

● اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد "أَكَلَ .... يَأْكُلُ أَكْلًا" (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو "...... کو کھانا یا کھا جانا" ہیں۔ اور اس لیے عربی میں "اَكْلَه" کے معنی "مضغه و بلعه" لکھے ہوتے ہیں یعنی "چبا کر نگل لینا"۔ پھر بطور استعارہ و تشبیہ یہ فعل "اڑانا، تلف کرنا، ہڑپ کر لینا (پیٹ میں بھرنا" وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور عبارت کے سیاق و سباق سے اس کے حقیقی (لفظی) یا کسی دوسرے مجازی اور بامحاورہ استعمال کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ فعل ہمیشہ متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے مثلاً کہیں گے "اَكَلَ الطعام" (اس نے کھانا کھایا)۔ البتہ بعض دفعہ اس کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "كُلَا" اس فعل مجرد سے فعل امر کا صیغہ تثنیہ مخاطب ہے جو مذکر و مؤنث ہر دو کے لیے برابر ہے یعنی "تم دونوں (مرد یا عورت) کھاؤ"۔ اس سے فعل امر کی گردان "كُلْ، كُلَا، كُلُوا، كُلِي، كُلَا اور كُلْنَ"، ہوگی یعنی ان تمام صیغوں میں شروع کا ھمزۃ الوصل اور اصل مادہ

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کے علاوہ لفظ "زوج" کے بارے میں پوری وضاحت البقرہ : ۲۵ یعنی ۲ : ۱۸ : ۱ (۸) میں گزر چکی ہے۔

● آیتِ زیرِ مطالعہ میں " زوج " کے معنی " بیوی " ہیں۔ کیونکہ مرد مخاطب (آدم) کے زوج (جوڑے) کی بات ہو رہی ہے۔ اس لیے اردو میں اس کا ترجمہ " بیوی " ، " بی بی " اور " جورُو " کیا گیا ہے۔ بعض نے صرف "عورت" ترجمہ کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست ہے۔ اگرچہ وہ " زوج " سے زیادہ " امرأة " کا ترجمہ لگتا ہے۔

۲ : ۲۵ : ۱ (۲) [الجَنَّةَ] کا مادہ "ج ن ن" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعْلَةٌ" ہے۔ (الجنۃ کی آخری تاء کی فتحہ (ــَـ) کی وجہ آگے " الاعراب " میں بیان ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کے استعمال اور خود لفظ "جَنَّةٌ" اور اس کی جمع " جناتٌ " پر البقرہ : ۲۵ یعنی ۲ : ۱۸ : ۱ (۴) پر مفصل بات ہو چکی ہے۔ " جنۃ " کے معنی " باغ " ہیں۔ یہاں (قصۂ آدم میں) " الجنۃ " سے مراد کونسی جنت یا کون سا " باغ " ہے۔ اس کے لئے کسی اچھی اور مستند تفسیر کو دیکھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ بعض " روشن خیالوں " نے " جنۃ " کو ایک جگہ (Place) کی بجائے ایک حالت (State) مراد لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان حضرات کے اس " جدید مفہوم " کی توجیہ کسی فلسفیانہ موشگافی کے ذریعے سے ہو تو ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے پہنچنے والی تفسیر سے تو اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اور صحابہؓ قرآن کے الفاظ و معانی (یعنی ظاہر و باطن) کے فہم پر یقیناً بعد میں آنے والوں کی نسبت زیادہ قادر تھے۔

۲ : ۲۵ : ۱ (۳) [وَكُلَا مِنْهَا] یہ دراصل " وَ " (اور) + " كُلَا " (جس کی وضاحت ابھی ہوگی) + " مِن " (میں سے) + " ھا " (ضمیر مؤنث بمعنی " اس ") کا مرکب ہے۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

اس میں لفظ " کُلَا " کا مادہ " ا ک ل " اور وزنِ اصلی " اُفْعُلَا " ہے۔ یعنی اس کی اصلی شکل " اُأْ کُلَا " بنتی تھی اور اسے عربوں کے نطق میں قاعدۂ مھموز [ھمزۂ متحرکہ کے بعد ھمزہ ساکنہ ماقبل کی حرکت کے موافق حرف (ا، و یا ی) میں بدل جاتا ہے۔] کے مطابق " اُوْ کُلَا " ہونا چاہیے تھا مگر علمائے صرف نے دیکھا کہ عرب لوگ تین افعال " اَخَذَ ، اَمَرَ اور اَکَلَ " کے فعل " امر " میں خلافِ قیاس (یعنی اس طرح کے دیگر مھموز الفاء افعال کے طریقِ استعمال کے برعکس) ابتدائی ھمزہ گرا کر بولتے ہیں۔

● اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد " اَکَلَ .... یَأْکُلُ أَکْلًا " (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو " ..... کو کھانا یا کھا جانا " ہیں۔ اور اس لیے عربی میں " اَکْلہ " کے معنی " مضغہ و بلعہ " لکھے ہوتے ہیں یعنی " چبا کر نگل لینا "۔ پھر بطور استعارہ و تشبیہ یہ فعل " اڑانا ، تلف کرنا ، ہڑپ کر لینا (پیٹ میں بھرنا " وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور عبارت کے سیاق و سباق سے اس کے حقیقی (لفظی) یا کسی دوسرے مجازی اور یا محاورہ استعمال کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ فعل ہمیشہ متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے مثلاً کہیں گے " اَکَلَ الطعام " (اس نے کھانا کھایا)۔ البتہ بعض دفعہ اس کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے ـــــــ

● زیر مطالعہ لفظ " کُلَا " اس فعل مجرد سے فعل امر کا صیغہ تثنیہ مخاطب ہے جو مذکر و مؤنث ہر دو کے لیے برابر ہے یعنی " تم دونوں (مرد یا عورت) کھاؤ " اس سے فعل امر کی گردان " کُلْ ، کُلَا ، کُلُوْا ، کُلِیْ ، کُلَا اور کُلْنَ " ہوگی۔ یعنی ان تمام صیغوں میں شروع کا ھمزۃ الوصل اور اصل مادہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کا ھمزہ (فاء کلمہ) ساقط کردیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے مختلف صیغے نوّے (۹۰) سے زائد مقامات پر آئے ہیں۔ اور بعض جامد اور مشتق اسماء بھی سولہ (۱۶) جگہ آئے ہیں جن پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی۔ انشاء اللہ۔
قرآن کریم میں اس مادہ سے مزید فیہ کا کوئی فعل وغیرہ استعمال نہیں ہوا اگرچہ عربی زبان میں اس سے مزید فیہ کے متعدد ابواب سے مختلف معانی کے لیے افعال استعمال ہوتے ہیں۔

۲:۲۵:۱(۵) [رَغَداً] کا مادہ "ر غ د" اور وزن "فَعَلاً" ہے اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "رغِدَ یرغَد رَغَدا" عموماً باب سمِعَ سے (اور کبھی باب کرُم سے بھی) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "کثرت، دلچسپی اور عمدگی والا ہونا" "اچھی چیزوں سے بھرپور ہونا"۔ اس کا فاعل عموماً "عَیْشٌ" (زندگی) ہوتا ہے مثلاً کہیں گے "رغِد عیشُ الرجلِ" (اس آدمی کی زندگی مزے کی ہوگئی)۔ خیال رہے عربی میں "عَیْشٌ" یا "عِیْشَۃ" زندگی بسر کرنے یا گزارنے کی حالت یا طریقے کو کہتے ہیں (یعنی "گزر بسر")۔ جس کا اردو ترجمہ "زندگی" ہی سے کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا مفہوم "حیاۃ" (زندہ رہنے کی مدت) بمقابلہ "مَوْت" سے مختلف ہے اگرچہ اردو ترجمہ اس کا بھی "زندگی" ہی کیا جاتا ہے (جو دراصل فارسی لفظ ہے)۔

● اس طرح "رَغَدٌ" کا مطلب ہے "عمدہ، مزیدار اور بہت"۔ اور اس معنی کے لیے "رَغْدٌ" اور "رَغِیْدٌ" بھی آتے ہیں۔ جو ایک طرح کی صفت ہے اور اس کا موصوف "زندگی یا وسائل زندگی (پانی، نباتات وغیرہ) ہو سکتے ہیں۔ اور "رَغَدٌ" لفظ "راغِدٌ" کی جمع کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے جو مردوں عورتوں دونوں کے لیے آتا ہے مثلاً کہتے ہیں "قومٌ رَغَدٌ یا نساءٌ رَغَدٌ" (یعنی مزے بھری زندگی والے مرد یا عورتیں) ــــ تاہم یہ استعمال قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا بلکہ اس مادہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

(ر غ د) سے کوئی فعل وغیرہ بھی استعمال نہیں ہوتا۔ صرف یہی ایک لفظ "رَغَدًا" (بصورت منصوب) تین جگہ وارد ہوا ہے۔ اور اس کے بامحاورہ اردو ترجمہ (بافراغت، جو چاہو، بے روک ٹوک، خوب) کو سمجھنے کے لیے اس عبارت کی ترکیب نحوی کو جاننا ضروری ہے۔ جو ابھی آگے بحث "الاعراب" میں سامنے آئے گی۔

۲: ۲۵: ۱ (۶) [حَيْثُ] یہ ایک اسم ہے جو "ظرف" کا کام دیتا ہے جو ہمیشہ مبنی بر ضمہ (ـُـ) ہوتا ہے یعنی اس کی آخری "ث" ہمیشہ ضمہ (ـُـ) کے ساتھ پڑھی اور بولی جاتی ہے چاہے اس سے پہلے کوئی حرف الجر بھی کیوں نہ آجائے۔ "مِن حیثُ" اور "حیثُ" کے معنی ایک ہی ہیں۔ یہ لفظ (حَیْث) ہمیشہ مکان (یعنی جگہ کے مفہوم) کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کا اردو ترجمہ "جہاں، جس جگہ، جہاں کہیں، جہاں سے اور جدھر سے" کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

عموماً اس (حیث) کے بعد ایک جملہ آتا ہے جو زیادہ تر فعلیہ ہوتا ہے (جیسے یہاں "شِئْتُمَا" آیا ہے) اور نحوی اعتبار سے اس جملے کو "حیثُ" کا مضاف الیہ سمجھا جاتا ہے (کیونکہ "ظروف" مضاف ہو کر استعمال ہوتے ہیں) کبھی اس (حیثُ) کے بعد "مَا" لگا دیتے ہیں۔ اس وقت "حیثُمَا" شرطیہ ہو جاتا ہے یعنی "جہاں کہیں بھی، جس جگہ بھی، جدھر سے بھی" کے معنی دیتا ہے ــــ اور یہ (حیثُما شرطیہ) دو مضارع فعلوں کو جزم دیتا ہے (شرط اور جواب شرط ہونے کی وجہ سے)۔ اس (حیثُ) کے یہ استعمالات بھی آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مادہ (ح ی ث) سے کوئی فعل یا اور اسم عربی زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتا۔ سوائے اسی ایک اسم "حیثُ" کے جو ظروف مبنیہ میں سے ایک ہے۔ قرآن کریم میں "حیثُ" ۳۱ جگہ

© rasailojaraid.com

آیا ہے جس میں دو دفعہ " مَا " کے ساتھ آیا ہے۔

۲ : ۲۵ : ۱ (۷) [شِئْتُمَا] کا مادہ " ش ی أ " اور وزنِ اصلی " فَعِلْتُمَا " ہے یعنی یہ دراصل " شَیِئْتُمَا " تھا۔ صرفی قاعدہ ہے (یا یوں کہئے کہ عربوں کے نطق کا طریقہ ہے) کہ کسی فعل اجوف میں جب لام کلمہ (آخری حرف) ساکن ہو تو اس سے ماقبل کے متحرک حرفِ علت (و یا ی) کو کتابت اور تلفظ سے گرا دیا جاتا ہے۔ اور گرنے والے حرف کی حرکت اگر ضمہ (ـُـ) ہو یعنی فعل نصَر یا کرُم سے ہو تو فعل کے ابتدائی حرف (فاء کلمہ) کو حرکت ضمہ (ـُـ) دی جاتی ہے جیسے آپ نے " کنتم " کی تعلیل میں پڑھا تھا (دیکھئے البقرہ : ۲۳) یعنی ۲ : ۱۷ : ۱ (۱) میں ــــــ اور اگر گرنے والے حرف علت کی حرکت فتحہ (ـَـ) یا کسرہ (ـِـ) تھی (یعنی وہ فعل نصر اور کرم کے علاوہ کسی اور باب سے تھا) تو فاء کلمہ یعنی ابتدائی حرف کو کسرہ (ـِـ) ہی دی جاتی ہے ــــــ اس قاعدے کے تحت ہی یہ صیغہ " شَیِئْتُمَا " سے " شِئْتُمَا " بنا ہے۔ یعنی عرب لوگ اسے اصلی شکل کی بجائے یوں بولتے ہیں۔

● اس مادہ (ش ی أ) سے فعل مجرد " شاء ... یشاءُ مَشِیئَۃً (باب سمع سے) (دراصل شَیِئَ یَشْیَؤُ ") آتا ہے۔ اس کے معنی (چاہنا) اور استعمال نیز تعلیل وغیرہ پر اس سے پہلے البقرہ : ۲۰ یعنی ۲ : ۱۵ : ۱ (۸) میں بات ہو چکی ہے۔

زیرِ مطالعہ لفظ " شِئْتُمَا " اس فعل سے ماضی معروف کا صیغہ تثنیہ حاضر ہے (جو کہ مذکر مؤنث کے لیے یکساں ہے) اس طرح اس کا لفظی اردو ترجمہ تو ہے " تم دونوں نے ارادہ کیا یا چاہا "۔ مگر شروع میں " حیث " (جہاں سے) لگنے کی وجہ سے بامحاورہ ترجمہ صرف " چاہو " سے کیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.

۲:۲۵:۱(۸) [وَلَا تَقْرَبَا] کی ابتدائی " وَ " تو عاطفہ بمعنی "اور" ہے اور " لا تقربا " کا مادہ " ق ر ب " اور وزن " لَا تَفْعَلَا " ہے ۔ اس مادہ سے فعل مجرد دو طرح استعمال ہوتا ہے ۔

(۱) قَرِبَ..... یقرَبُ قُرْبًا (باب سمع سے) آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں : "..... کے نزدیک جانا ، ...... کے پاس جانا" ۔ یہ فعل متعدی ہوتا ہے ۔ اور اس کا مفعول براہِ راست (بنفسہ) آتا ہے ۔ اور یہ حقیقی اور مجازی دونوں معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً " قَرِبَ الشَّیْئَ " (وہ چیز کے قریب گیا) میں حقیقی اور " قَرِبَ زَوْجَتَہ " (وہ اپنی بیوی کے قریب گیا) میں مجازی معنی مراد ہیں اور البقرہ : ۲۲۲ میں " ولا تقربوھن " میں یہ فعل ان ہی (مجازی) معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

(۲) البتہ یہ فعل باب کرُم سے (قرُب یقرُب قرابۃً وقُربیٰ) بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اس وقت یہ فعل لازم ہوتا ہے یعنی اس کے معنی "قریب ہونا ، قریب آ پہنچنا " ہوتے ہیں اور اس صورت میں جس سے قریب ہونے کا ذکر کرنا ہو تو فعل پر " مِن " یا " اِلیٰ " کا صلہ لگاتے ہیں مثلاً قرُبَ مِنْہُ و اِلَیْہِ (وہ اس کے قریب پہنچا) اس سے ہی اسم صفت قَرِیْبٌ (نزدیکی ۔ پاس والا) بروزن " فعیل " بنتا ہے اور افعل التفضیل " اَقْرَبُ " (زیادہ قریب) بھی اسی باب (کرُم) والے معنوں سے بنتا ہے ۔

● زیرِ مطالعہ لفظ " لا تقربا " اس فعل مجرد کے باب سمِعَ سے فعل نہی کا صیغہ تثنیہ مخاطب (مذکر مؤنث ہر دو کے لیے) ہے اور اس کا ترجمہ ہوگا : تم دونوں ..... کے قریب / پاس نہ جاؤ ۔"

۲:۲۵:۱(۹) [ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ] میں " ھٰذہ " تو اسم اشارہ برائے قریب (مؤنث) ہے جس کا اردو ترجمہ " یہ " یا " اس "

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

سے کیا جاتا ہے ۔ اسماء اشارہ کی ساخت اور معنی وغیرہ کے لیے البقرہ: ۲ یعنی ۲:۱:۱(۱) دیکھئے ۔

" الشَّجَرَةَ " (جو یہاں مشارٌ الیہ ہے) کا مادہ " ش ج ر " اور وزن (لام تعریف نکال کر) " فَعَلَةٌ " ہے (اس کی نصب کی وجہ " الاعراب " میں بیان ہوگی ۔

اس مادہ سے فعل مجرد " شَجَرَ یَشْجُرُ شَجْرًا " (باب نصر سے) آتا ہے ۔ اور اس کے ایک معنی " جھگڑے کا سبب بننا " بے چینی اور اضطراب پیدا کرنا ، باعث نزاع ہونا " ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم میں اس فعل سے ان ہی معنوں کے لیے صرف ایک جگہ (النساء : ۶۲) فعل ماضی کا ایک صیغہ آیا ہے ___ ویسے عربی زبان میں یہ فعل مجرد لازم متعدی اور معروف ومجہول اور " عن " کے صلہ کے ساتھ مختلف معانی (مثلاً ......کو باندھنا ......کو سٹانا ، جدا کر دیا جانا وغیرہ) کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ڈکشنریوں میں دیکھے جا سکتے ہیں ___ اس مادہ سے ماخوذ لفظ " شجرٌ یا شجرۃ " مختلف صورتوں میں تیس سے زائد جگہ آیا ہے ۔

● لفظ " شَجَرٌ " اس مادہ سے ماخوذ ایک اسم جامد ہے ۔ اور اس کے بنیادی معنی ہیں : " زمین سے اُگنے والا وہ پودا یا نباتات جس کا مضبوط تنا ہو ۔ اور وہ اوپر کی طرف اُگتا اور بڑھتا ہو " ___ اور جو (بیل وغیرہ کی طرح) صرف زمین پر پھیلے اور اس کا (مضبوط) اٹھانے والا " تنا " نہ ہو تو اسے عربی میں نَجْمٌ یا عَشَبٌ یا حشِیْش (گھاس ، بوٹی ، بیل وغیرہ) کہتے ہیں ۔ شجر کے لیے اردو فارسی کا لفظ " درخت " استعمال ہوتا ہے ۔

تاہم عربی میں " شجر " سے مراد ہر وہ پودا ہے جسے آپ درخت کہہ سکتے ہیں یعنی " شجر " اسم جنس ہے جو عام یا تمام درختوں پر بولا جاتا ہے ۔ جب کوئی ایک (عدد) درخت یا بعض درخت مراد لینا ہو تو اسے " شجرۃ "

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

کہتے ہیں۔ عربی میں اس تاء (ۃ) کو تائے وحدت کہتے ہیں۔ اور یہ کسی جنس یا نوع سے کوئی ایک فرد مراد لینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً "ثَمَرٌ" (بحیثیت مجموعی ہر طرح کے پھل) مگر ثَمَرَۃٌ (کوئی خاص یا ایک ایسا پھل جس کی بات ہو رہی ہو) اس طرح کے کئی اور الفاظ (مثلاً بقر سے بقرۃ اور لیل سے لیلۃ وغیرہ) آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گے۔

● قرآن کریم میں لفظ "الشجر یا شجر (بغیر تائے وحدت) سات جگہ اور تائے وحدت کے ساتھ (الشجرۃ یا شجرۃ) ۱۹ جگہ آیا ہے۔

۲:۲۵:۱(۱۰) [فَتَكُوْنَا] یہ دو کلمات کا مجموعہ ہے یعنی حرف فاء (فَ) اور فعل "تکونا" سے مل کر بنا ہے۔ دونوں کا مختصر بیان یوں ہے:

(فَ) یعنی فاء مشہور حرف عطف ہے اور زیادہ تر ترتیب (بعض چیزوں کا نمبروار بیان) یا تعقیب (ایک چیز کا دوسری کے بعد واقع ہونا) کا مفہوم دیتی ہے۔ اور معطوف اور معطوف علیہ کا اعراب ایک ہی ہوتا ہے۔ فاء کی ایک قسم سببیہ بھی ہے جس سے پہلے بیان کردہ بات اس کے بعد بیان کردہ بات کا سبب ہوتی ہے یہ عموماً نفی یا طلب (یعنی امر، نہی، استفہام، تمنا وغیرہ) کے بعد آتی ہے اور اس کے بعد اگر فعل مضارع ہو تو اس کی وجہ سے وہ منصوب ہو جاتا ہے۔ اگر فاء جواب شرط کے شروع میں آئے تو یہ مضارع کو جزم بھی دیتی ہے۔ مندرجہ بالا تمام صورتوں میں "فَ" کا اردو ترجمہ "پس" ہی سے کیا جاتا ہے۔ البتہ کبھی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے حسب موقع اس کا ترجمہ "پھر"، "چنانچہ"، "تو"، "اس بناء پر"، "اس کی وجہ سے"، "ورنہ"، "نہیں تو"، "اس کے بعد" کی صورت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں زیرِ مطالعہ عبارت میں اس کا موزوں ترجمہ "ورنہ" یا "نہیں تو" ہی ہو سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

فاء کے مختلف معانی و استعمالات پر البقرہ : ۲۲ یعنی ۲ : ۱۶ : ۱ (۱۰)
میں بھی بات ہوئی تھی۔

● "تَكُونَا" کا مادہ "ک و ن" اور وزن اصلی "تَفْعُلَا" ہے
اس کی اصلی شکل "تَكْوُنَا" تھی۔ جس میں عربوں کے طریق تلفظ کے مطابق
"واو" کی حرکت ضمہ (ـُـ) ماقبل صحیح ساکن (ک) کو دے دی جاتی ہے اور
ماقبل کے مضموم ہو جانے کی بناء پر "واو" برقرار رہتی ہے۔

یہ (تکونا) اس مادہ سے فعل مجرد "کان یکون کَوْنًا" (بمعنی ہونا۔
ہو جانا) سے فعل مضارع معروف (منصوب بوجہ فاء سببیہ) کا صیغہ تثنیہ حاضر
ہے اس طرح "فتکونا" کا ترجمہ یہاں "ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے"
یا "نہیں تو تم دونوں ہو گے" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ فعل "کان
یکون" کے معنی اور قواعد استعمال پر اس سے پہلے البقرہ : ۱۰ یعنی
۲ : ۸ : ۱ (۱۰) میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

۲ : ۲۵ : ۱ (۱۱) [مِنَ الظّٰلِمِيْنَ] کے شروع والا "مِن" یہاں
تبعیضیہ ہے جس کا ترجمہ "میں سے (ایک)" ہو گا۔

اور "الظالمین" (یہ رسم املائی ہے رسم عثمانی پر آگے بات ہو گی)
کا مادہ "ظ ل م" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "فَاعِلِيْنَ" ہے۔
اس مادہ سے فعل مجرد "ظَلَمَ يَظْلِمُ ظُلْمًا" (بے انصاف ہونا،
حد سے بڑھنا، کسی کا حق مارنا وغیرہ) کے باب، معنی اور استعمال پر البقرہ : ۲۰
یعنی ۲ : ۱۵ : ۱ (۵) میں بات ہو چکی ہے۔

● "الظالمین" اس فعل سے صیغہ اسم الفاعل "ظالم" کی جمع سالم
(معرف باللام اور مجرور بالجر) ہے۔ ظالم کا اردو ترجمہ "ظالم، بے انصاف،
حد سے گزرنے والا، اپنا نقصان کرنے والا اور گناہ گار" سے کیا گیا ہے۔
اس لیے کہ ظالم اور بے انصاف حد سے گزرنے والا بھی ہوتا ہے۔ اور

© rasailojaraid
© rasailojaraid

دراصل (بلحاظ نتائج یا بالآخر) اپنا ہی نقصان کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ اور کوئی گناہ (یا برا کام) کرنا دراصل اپنے اوپر ظلم کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے "الظالمین" کے ترجمہ میں مندرجہ بالا کلمات اختیار کیے گئے ہیں۔

۲:۲۵:۲ الإعراب

وقلنا یادم اسکن انت و زوجک الجنۃ ــــ وکلا منھا رغدا حیث شئتما ــــ ولا تقربا ھذہ الشجرۃ ، فتکونا من الظلمین ۔

آیت زیرِ مطالعہ نحوی اعتبار سے تین مستقل فعلیہ جملوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں ہم نے اوپر وقفہ کی لکیروں سے کر الگ الگ لکھا ہے۔ تاہم یہ سب جملے واو عاطفہ کے ذریعے مل کر ایک ہی طویل جملہ بناتے ہیں۔ الگ الگ اعراب کی تفصیل یوں ہے:

(۱) وقلنا یٰآدم اسکن انت و زوجک الجنّۃ ۔

[وَ] عاطفہ ہے جس سے مابعد والے جملے کا ماقبل والے جملے پر عطف ہوتا ہے ــــ [قلنا] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعل "انت" (مستتر) ہے۔ [یا] حرف ندا ہے اور [آدم] منادی مفرد مرفوع مگر مبنی بر ضمہ (ـُـ) ہے۔ لفظ "آدم" ویسے بھی غیر منصرف ہے۔ [اُسکُن] فعل امر معروف صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ جس میں ضمیر فاعل "انت" مستتر ہے۔ [انتَ] یہ پچھلے فعل (اسکن) کی ضمیر فاعل ہے جو تاکید کے لیے باہر (دوبارہ) لائی گئی ہے تاکہ اگلے اسم (وزوجُکَ) کا اس پر عطف درست ہو سکے۔ اس لیے کہ "وَ" کے ذریعے کسی ضمیر مستتر پر عطف درست نہیں بنتا۔ یعنی "اسکن و زوجُک" کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ "اسکن" تو مخاطب کا صیغہ ہے جس کا فاعل کوئی

© rasailojaraid.

اسم ظاہر نہیں ہو سکتا یا تو پھر فعل امر غائب (مثلاً لِيَسْكُنْ = چاہیئے کہ رہے) دوبارہ لائی جائے (یعنی وَلْيَسْكُنْ زَوْجُكَ کہا جائے) اس کی بجائے ایسے موقع پر جب کوئی فعل اپنی ضمیر فاعلی (یا فاعلین) اور کسی اسم ظاہر دونوں کے لیے آرہا ہو تو (چاہے وہ فعل امر ہو یا نہی یا ماضی یا مضارع) اس فعل کی ضمیر فاعل (یا "فاعلہ" یا "فاعلین" یا "فاعلات" جیسی بھی صورت ہو) باہر نکل کر اسم ظاہر کو "وَ" کے ذریعے اس پر عطف کرتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔ [وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے اسم ظاہر (زَوْجُكَ) کو ضمیر تاکید "انتَ" پر عطف کیا گیا ہے۔ [زَوْجُكَ] مضاف (زوج) اور مضاف الیہ (ضمیر مجرور "كَ" مل کر ضمیر برائے تاکید (انتَ) پر معطوف ہے۔ [الْجَنَّةَ] فعل "اسْكُنْ" کا مفعول بہ یا مفعول فیہ ہے (یعنی دونوں طرح ممکن ہے) اس طرح "یا آدم اسکن انتَ و زوجك الجنة" کا لفظی ترجمہ ہوگا: اے آدم رہ تو اور تیری بیوی (بھی رہے) جنت (باغ) میں" جس کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ "اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو" یا "اے آدم تو اپنی بی بی سمیت جنت میں رہ" یا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں بسو، کی صورت میں کیا گیا ہے۔

(۲) وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔

[وَ] عاطفہ ہے جو بعد والے فعل (كُلَا) کو سابقہ فعل (اسْكُنْ) پر عطف کرتی ہے (یعنی رہو اور کھاؤ)۔ [كُلَا] فعل امر معروف کا صیغہ تثنیہ مخاطب ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتُما" مستتر ہے۔ (یعنی تم دونوں کھاؤ)۔ [مِنْهَا] جار (مِنْ) اور مجرور (ضمیر "هَا") مل کر فعل (كُلَا) سے متعلق ہیں اس میں ضمیر "ها" جنت کے لیے ہے۔ [رَغَدًا] کی بلحاظ اعراب یہاں دو صورتیں ممکن ہیں (۱) یا تو یہ ایک محذوف مصدر (یعنی مفعول مطلق) کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تقدیرِ عبارت کچھ یوں

© rasailojaraid.com

بنتی ہے : " کُلَا اَکْلاً رَغَدًا " یعنی کھاؤ، ایسا کھانا جو " رَغَدٌ " (عمدہ، بہت، مزے دار، بغیر کسی روک ٹوک کے) ہو۔ اسی بناء پر بعض مترجمین نے اس (کُلا رغدًا) کا ترجمہ " جو جی چاہو کھاؤ " ، " بے روک ٹوک کھاؤ " کیا ہے۔ (ii) دوسری ترکیب نحوی یوں ہو سکتی ہے کہ " رَغدًا " کو مصدر بمعنی اسم الفاعل لے کر اسے حال (لہذا منصوب) سمجھا جائے۔ [مصدر کا اسم الفاعل یا اسم المفعول کے معنی میں کسی جملے کے اندر حال کا کام دینا عربی زبان اور خود قرآن کریم میں بہت عام ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں آگے ہمارے سامنے آئیں گی] ۔ اس صورت میں گویا تقدیر عبارت ہو گی " کُلَا راغدَیْن " (یعنی تم دونوں کھاؤ مزے لینے والے ہوتے ہوئے' فراغت والے ہوتے ہوئے مزے کی زندگی گزارنے والے ہوتے ہوئے۔ دیکھئے اوپر حصہ اللغۃ میں رغدًا کی بحث)۔ اس اعراب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض مترجمین نے اس (رغدًا) کا ترجمہ " محظوظ ہو کر " ، اور " بافراغت " اور " فراغت کے ساتھ " کیا ہے۔

[حیثُ] ظرف مکان مبنی بر ضمہ (ـُـ) ہے یعنی " وہ جگہ جو " کے مفہوم کے ساتھ اور اس (ظرف) کا تعلق فعل " کُلَا " سے ہے [شِئْتُمَا] فعل ماضی معروف صیغہ تثنیہ مخاطب ہے جس میں ضمیر فاعلین " انتما " مستتر ہے اور یہ (شئتما) ایک پورا جملہ فعلیہ (فعل مع فاعل) ہو کر ظرف مکان (حیثُ) کی طرف مضاف ہے یعنی " اپنی مرضی کی جگہ "۔ جس (حیث شئتما کا بامحاورہ ترجمہ " جہاں چاہو، جس جگہ چاہو، جہاں تمہارا جی چاہے " سے کیا گیا ہے۔ اور بعض مترجمین نے ظرف کے بعد " سے " لگا کر بھی ترجمہ کیا ہے یعنی " جہاں کہیں سے چاہو، جس جگہ سے چاہو " کی صورت میں ــــ گویا اس میں " حیثُ " کا ترجمہ " من حیثُ " کی طرح کیا گیا ہے۔ تاہم اردو محاورہ کی رو سے یہ درست ہے۔ (اوپر دیکھئے " حیث "

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ای لغوی بحث)

(۳) ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین

[وَ] بھی عاطفہ ہے یعنی ابتدائی "قلنا" کے بعد بیان ہونے والے "احکام" کو باہم ملانے کا کام دیتی ہے (یعنی قلنا :۔ اسکن وَ ...... کلا ...... ولا تقربا) [لَا تَقْرَبَا] کی "لا" نہی کے لیے ہے اور "لا تقربا" فعل نہی معروف کا صیغہ تثنیہ حاضر ہے جو مذکر مؤنث کے لیے یکساں ہے۔ "نہی" کی وجہ سے یہاں مضارع مجزوم ہے یعنی "لا تقربان" کا آخری نون گر گیا ہے۔ اور "لا تقربا" میں ضمیر فاعلین "انتما" مستتر ہے۔ [ھذہ الشجرۃَ] میں "ھذہ" اسم اشارہ (برائے مؤنث قریب) ہے اور "الشجرۃ" اس کا مشارٌ الیہ ہے۔ اور یہ مرکب اشاری فعل "لا تقربا" کا مفعول بہ ہے اس لیے منصوب ہے۔ مگر نصب کی علامت صرف مشارٌ الیہ (الشجرۃَ) کی آخری "ۃ" کی فتحہ (ـَـ) کی صورت میں ظاہر ہے۔ اسم اشارہ "ھذہ" میں مبنی ہونے کے باعث نصب کی علامت ظاہر نہیں ہے۔ [فَتَکُونَا] میں فاء سببیہ ہے [جو عموماً فعل امر یا فعل نہی کے جواب پر یا استفہام اور نفی کے بعد آتی ہے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو وہ منصوب ہو جاتا ہے] جس نے یہاں فعل مضارع "تکونا" کو نصب دی ہے۔ علامتِ نصب صیغہ فعل (تکونانِ) کے آخری "نون" کا گرنا ہے۔ اور بعض مترجمین نے اسی لیے "فتکونا" کا ترجمہ "اس کی وجہ سے / ورنہ / نہیں تو ہو جاؤ گے" کی صورت میں کیا ہے ——— اور دوسری (اعرابی) توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "فاء" (فَ) کے ذریعے "تکونا" کا عطف پہلے (سابقہ) فعل نہی "لا تقربا" پر مانا جائے اس لیے یہاں "تکونا" بھی (تقربا کی طرح) فعل مجزوم ہو۔ جزم کی علامت بھی آخری

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com